چھت ٹپکتی ہے اُس پر لیپ کرنے کے لئے گارا تیار کرو.. وہیں سے آرہا ہوں اس لئے دیر ہو گئی ہے.. چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی چھٹی ہو گئی کہ اساتذہ سے گھر کا کام کرواتے ہیں.."

ہر علاقے ہر ثقافت اور ہر مذہب کی حس مزاح الگ الگ ہوتی ہے.. خاور بھی مرغابی آزردگی سے کسی حد تک باہر آگیا.. مسکراتا رہا لیکن سرور اور فہیم نے اگر بُوٹی سے بھرا کجا خالی نہ بھی کیا ہوتا تو وہ اسی انداز میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہوتے..

ماماں جعفر اس کُنجے میں شریک نہ ہوا تھا.. اُس نے اپنا بند وبست الگ کیا تھا.. کشتی کو کناروں کے ساتھ باندھنے کے عمل سے فارغ ہو کر وہ فوراً کسی آبائی نسخے کے مطابق بھنگ گھوٹنے میں مصروف ہو گیا تھا.. اس لئے اُس پر رنگ چوکھا آیا تھا.. وہ ایک فلسفی کی طرح دریا کے کنارے آہستہ آہستہ چلتا جاتا جیسے کسی کائناتی گتھی کو سلجھانے میں مگن ہو اور پھر بہت دور جا کر ریت پر براجمان ہو کر پانیوں کی سیاہ چادر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا.. پھر ہڑبڑا کر اُٹھتا اور نہایت خوفزدہ حالت میں بگٹٹ بھاگتا اُن کے قریب آجاتا.. اُنہیں دیکھ کر ہنستا اور پھر سے فلسفی ہو کر دریا کے کنارے چلنے لگتا.. اُس نے اپنی ساوی میں کسی کو شریک نہیں کیا تھا..

"گھر کب جائیں گے سائیں.." فہیم ہنستا ہوا چپ ہو گیا.. اُسے دیکھا.. اور وہ دیر سے چپ تھا..

"کونسے گھر؟"

"آپ کا گھر تو ہے ناں سائیں.. جہاں سے آپ ادھر ہمارے دیس میں آئے ہیں.."

"نہیں..."

"جانے دیں سائیں.. شمر کی طرح مخول تو نہ کریں.. بندے بشر کا کوئی نہ کوئی گھر تو ہوتا ہے جدھر وہ لوٹتا ہے.."

"نہیں ہے فہیم.. کوئی بھی دیوار.. چار دیواری.. کوئی ایک چھت اس وقت وجود میں نہیں ہے جو میرا گھر ہو سکے.. اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ میں نے کب اور کہاں واپس جانا ہے.."

فہیم نے پہلے تو اس بیان پر قہقہہ لگانے کے بارے میں سوچا کہ بُوٹی کی سرمستی نے اُس کے اندر جو دُھوم مچائی تھی اُس کا یہی تقاضہ تھا لیکن پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پا کر

بے یقینی کے عالم میں سنجیدہ سی شکل بنائے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ سائیں کیا کہتے ہو گھر تو ہر ایک کا ہوتا ہے.. اُس مرغابی کا بھی ہو گا جو ہم نے بھون کر کھائی ہے..

"تم کیوں پوچھتے ہو فہیم؟"

"سائیں سرور آپ سے بات کرتے ہوئے جھجکتا ہے تو وہ پوچھتا تھا... کہتا تھا کہ کئی دن ہو گئے ہیں سندھ کے پانیوں میں.. ادھر شکار و کار.. دارو شارو.. وغیرہ کا تو کوئی پروگرام نہیں تو.. صاحب سے پوچھ دو کہ واپس کب ہونا ہے.."

"مجھے نہیں معلوم... ان لوگوں سے برمانی نے یہی طے کیا تھا کہ جب تک میں کہتا ہوں انہوں نے چلتے جانا ہے.. ان کو ادائیگی ہوتی جائے گی.. تو انہیں کیا غرض ہے کہ کوئی پروگرام ہے یا نہیں.. یہ کشتی کھیتے جائیں.."

"جو حکم سائیں.." فہیم نے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی اظہار نہ کیا "اجازت دو سائیں.. نیند بلاتی ہے" وہ اُٹھا.. اور اُس کے اُٹھنے سے.. پاؤں میں بوٹی کی جو مستی تھی اُس کی ٹھوکر سے مرغابی کا ایک اور پَر فضا میں بلند ہوا...

فہیم چلا گیا لیکن وہ پَر ہوا میں معلق رہا...

جعفر اور سرور بھی اپنی اپنی تاریکی میں اُتر گئے.. الاؤ مکمل طور پر راکھ ہو چکا تھا.. کہیں کوئی ایک چنگاری بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود اُس کی روشنی کا گمان موجود تھا.. اور اس گمان میں وہ ایک پَر دکھائی دیتا تھا.. جس کے بغیر وہ پرندہ روز حشر سمیٹا نہیں جا سکتا تھا.. اس ایک پَر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا..

کیا یہ پَر تھا یا اُس کے ہونے کا گمان تھا..

"انڈس کوئین" کا سفر جاری تھا..

وہ بے آواز گزرتی تھی..

اُس کے سٹیم انجن کی آواز نہ آتی تھی..

عرشے پر کوئی گہما گہمی نہ تھی.. معمول کی رونق نہ تھی.. نہ راج کے برتر آقا تھے اور نہ اُن کے آگے جھکے ہوئے غلام تھے... یہاں تک کہ کموڈ بھی خالی تھا.. البتہ قمقمے اُسی طور روشن تھے اور جھولتے تھے.. ویرانی تھی.. اور عرشے کے درمیان میں ایک بدن پڑا تھا جس پر جا بجا دھبے اور کھرینڈ تھے... نیپام بموں کی ہلاکت خیز آگ سے فرار ہوتی خوفزدہ.. روتی

ہوئی.. ناتواں ٹانگوں سے بھاگتی ہوئی ایک برہنہ بچی کا بدن تھا جو عرشے پر پڑا تھا... غلافی آنکھیں اُس پر جھکیں آنسو بہاتی تھیں..

جیسے ایک پُرا بھی تک فضا میں معلق تھا.. یا اُس کا گمان تھا جو ٹھہرا ہوا تھا.. بجھ چکے الاؤ کی مانند...

ایسے انڈس کوئین تھی جو سندھ کے پانیوں پر بے آواز گزرتی تھی..

اور برہنہ بچی کا بدن عرشے پر پڑا تھا.. شاید یہ بھی ایک گمان تھا..

"میرے ساتھ آجائیں سائیں..."

کراچی ایئرپورٹ کے بے ترتیب بھیڑوں ایسے انسانی اژدہام میں سے اپنے آپ کو کھینچتا' بچاتا جب وہ باہر آیا اور ایڈورٹائزنگ فرم کے اُس ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا جو ہر ہفتے اُسے ایئرپورٹ پر لینے آتا تھا تو اُس کے سامنے یکدم ایک جن کی طرح گھنی مونچھوں اور شیشوں سے بھری چوکور سندھی ٹوپی اوڑھے ایک شخص نمودار ہوا اور ذرا جھک کر کہنے لگا "میرے ساتھ آجائیں سائیں.."

اُس نے اُسے ایک نظر دیکھا.. وہ اُس کے چہرے سے ناواقف تھا.. چنانچہ جواب میں اُس نے کچھ نہ کہا.. چپ رہا اور ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا..

وہ شخص بھی چپ کھڑا رہا.. اور ایک خاص وقفے کے بعد جو ادب کے لئے درکار تھا پھر ذرا جھک کر بولا.. "سائیں آپ میرے ساتھ آجائیں.."

"تم کون ہو؟"

"میں قادر ہوں سائیں' آپ کو لینے آیا ہوں.. میرے ساتھ آئیں.."

"کہاں؟" وہ شکل سے بے حد مخدوش لگتا تھا اور کراچی ایسا شہر نہیں تھا کہ آپ کسی اجنبی کے ساتھ ایک دو فقروں سے زیادہ بات کرنے کا خطرہ مول لیں..

"گاڑی پارکنگ میں ہے سائیں.. آپ کا بیگ اُٹھاتا ہوں.."

"نہیں.."

"مہربانی کرو سائیں.."

"تمہیں.. کس نے بھیجا ہے؟" یہ ممکن تھا کہ فرم کا وہ ڈرائیور چھٹی پر چلا گیا ہو

اور یہ اُس کی جگہ آیا ہو..

"میرے ساتھ آئیں.. سرکار وہیں ہیں..."

سرکار... عابدہ سومرو تھی.. نسان پٹرول کی پچھلی نشست پر سیاہ گوگلز لگائے ونڈ سکرین کے پار دیکھتے ہوئے.. لیکن اُس کا چہرہ روشن تھا خوشی سے دمکتا ہوا.. اُس نے خاور کی جانب دیکھا نہیں لیکن اُس کا پورا وجود اُس کی موجودگی سے آگاہ تھا..

قادر نے نہایت ادب سے دروازہ کھولا اور وہ سمٹ کر ذرا پرے ہو گئی اور خاور اُس کے برابر میں بیٹھ گیا.. وہ بدستور سامنے دیکھے چلی جا رہی تھی اور اُس کی مسکراہٹ تھمنے میں نہ آتی تھی..

سوائے ونڈ سکرین کے تمام شیشے سیاہ تھے..

نسان پٹرول ایئرپورٹ پارکنگ سے باہر آ گئی..

وہ اُس کی خاموشی سے تنگ آ گیا "تم مجھے اغوا کر رہی ہو؟"

"ہاں.." اُس نے صرف اتنا کہا..

"کیا مطلب ہے' ہاں.." اُسے اُلجھن بھی ہو رہی تھی جو عابدہ سومرو کی قربت میں اُسے ہمیشہ ہوتی تھی اور اُسے یوں اچانک قریب پا کر مسرت کا ایک احساس بھی ہو رہا تھا.. اسی لئے وہ اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا..

"اس کے سوا چارا نہ تھا.. اب مرید کتنی بار مرشد کی چوکھٹ پر جائے.."

"مرید کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ مرشد روزی روزگار کے سلسلے میں اس شہر میں آیا ہے.. کسی رومینٹک ایڈونچر کے لئے نہیں.."

"آپ کا روزی روزگار تو ہم ہیں سائیں.." اُس نے ابھی تک اُسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور سامنے نظریں جمائے بُت بن بیٹھی تھی.. "سائیں آپ ہر ہفتے ادھر ہمارے گاؤں کراچی میں آؤ اور چپکے سے واپس چلے جاؤ.. ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں.."

"بہر حال آج پچھلے پہر چار بجے ایک اشتہاری مہم کے سلسلے میں میری ایک نہایت اہم میٹنگ ہے.."

"میٹنگ کینسل بھی ہو سکتی ہے سائیں لیکن میٹنگ نہیں.." وہ مسکراہٹ سے ہنسی میں چلی گئی.. آج اُس کی آواز میں وہ گہری جنس بھری رغبت مفقود تھی اور وہ نہایت نارمل

انداز میں گفتگو کر رہی تھی.. نہ ہی اُس میں کوئی دُکھ یا درماندگی تھی.. بلکہ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی پر سکون اور زندگی سے اُبلتی ہوئی خوش تھی..

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"میرے منہ پہ رونق نہیں آگئی.." اور وہ واقعی روشن ہو رہی تھی "بیمار کا حال اچھا ہے سائیں.. تمہیں دیکھنے سے"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جہاں میں تمہیں لے چلوں..."

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے بہر طور وہ میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے.. میں اُسے کسی حالت میں بھی مِس نہیں کر سکتا.."

"آپ کو پہنچا دیں گے سائیں.. ابھی تو بہت وقت ہے.. آپ ہماری راجدھانی میں ہیں.. یہاں ہمارا راج ہے.. ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں.."

"یعنی مجھے واقعی اغوا کیا جا رہا ہے.."

"ہاں.." اُس نے سر ہلایا اور سامنے ونڈ سکرین پر سیاہ گوگلز میں پوشیدہ آنکھیں جمائے مسکراتی رہی..

طارق روڈ پر گھنی ٹریفک ایک تسلسل اور ایک باقاعدگی سے حرکت کرتی جاتی تھی..

"میں تمہارے لئے ترس گئی تھی.." اُس نے پہلی بار اپنی نظریں ونڈ سکرین سے جدا کیں، سیاہ گوگلز اُتارے اور اُس پر بچھ گئی..

"فار ہیونز سیک.." اُس نے اپنے آپ کو چھڑایا "یہ تم کیا کر رہی ہو... ڈرائیور..."

"قادر کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا... یہ میرا امراز ہے.. جیسے حرم سراؤں کے خواجہ سرا زبان نہیں رکھتے تھے.. سب دیکھتے تھے لیکن کچھ نہیں کہتے تھے.." وہ پھر اُمڈنے لگی..

"نہیں..." اُس نے اپنے آپ کو پھر الگ کیا "مجھے.... یہ اچھا نہیں لگتا.."

"قادر جو کچھ دیکھتا ہے اُس کے مقابلے میں یہ تو بچوں کی چھیڑ چھاڑ ہے.. بابا سائیں کو اس نے کن حالتوں میں نہیں دیکھا.. یو کینٹ امیجن... باہر سے اندر کچھ دکھائی

نہیں دیتا اور قادر یہاں نہیں ہے.. تم سمجھ لو کہ ہم ایک بند کمرے میں ہیں' تنہا ہیں..."

"میں نہیں سمجھ سکتا.."

"لیکن میں تو سمجھ سکتی ہوں..."

فلیٹ فُلی فرنشڈ تھا..

اس میں اس کے مکین کی سانسیں ابھی تک موجود تھیں اور یہ باقاعدہ ایک رہائش گاہ تھا.. یہ وہ آماجگاہ نہیں تھی جو بوقت ضروری کھلتی ہے اور وہ ضرورت پوری ہونے کے بعد پھر بند سکوت میں اُتر جاتی ہے اور صرف ایک آرامدہ بستر اُس کی آرائش کا اہم ترین جز ہوتا ہے..

یہاں جو کوئی بھی رہتا تھا ذوق رکھتا تھا..

کوئی بھی روشنی براہ راست نہیں تھی.. مدھم اور ملائم انداز میں تھی..

آرائش اگرچہ جدید رنگ میں تھی لیکن اُس میں مشرق کا.. بلکہ سندھ کا ایک چھڑکاؤ بھی تھا.. جیسے شیف کسی خاص ڈش کی ترکیب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب... اے ڈیش آف سویا ساس... ایسے اس فلیٹ کے مغربی ڈیکور میں.. اے ڈیش آف سندھ..

اور اس ڈیش میں سب سے بھاری اور نمایاں پلنگ تھا... چوڑا' موٹے اور پستہ قد فیل پایوں پر براجمان پلنگ فرش سے دو بالشت بھی اونچا نہ ہوگا.. اُس پر بچھی رَلی کے ہر پیوند میں کہیں گول کہیں چوکور' شیشے بڑی نفاست سے ٹانکے گئے تھے... پلنگ کے سرہانے میں سے ایک چوبی مور کی شکل اُبھری ہوئی تھی جو کسی دیہاتی کاریگر نے تراشی تھی... اس میں نفاست تو نہیں تھی ایک خاص قسم کا کھردرا پن تھا اور یہی اس کی خوبی تھی.. مور کی اس شکل میں صرف مور نہ تھا بلکہ تراشنے والے کی قوت واہمہ بھی شامل تھی.. جس نے اُسے انوکھی وضع دے دی تھی۔ یہ پرندہ جو مور سے مشابہ تھا پَر سمیٹے ہوئے تھا اور اُس کی لمبی گردن کے نیچے جو بدن تھا اُس پر کسی ماہر آرائش نے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے پرانے فریم جڑے ہوئے تھے جن میں مختلف صورتوں اور شکلوں کے آئینے تھے.. ان میں ہر آئینہ دھندلایا ہوا اور بجھا ہوا تھا اور اپنی قدامت کے برسوں کی گواہی دیتا تھا.. جسامت میں الگ الگ.. کل سات آئینے تھے.. ہر آئینے کے گرد جو چوکھٹا تھا اُس کی نقاشی الگ تھی' قدامت میں فرق تھا... کسی پر بیل بوٹے کھدے تھے اور کسی پر صرف لاکھ کے گوڑے رنگ تھے... اگرچہ پرانے ہونے

کے باعث نیم سیاہ ہو رہے تھے... وہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ سندھ کے صحرائی خطوں کے دور افتادہ دیہات کے کچے کوٹھوں' گوپوں اور جھونپڑیوں میں سے آئے ہیں.. ان میں سینکڑوں چہرے جذب تھے جو انہیں دیکھتے تھے اور اپنے رُوپ پر ناز کرتے تھے.. اور جب یہ اُن کے لئے کسی کام کے نہ رہے.. ماند پڑ گئے' دھندلا کر اندھے ہونے کو آئے تو انہیں بڑے شہر سے آیا ہوا کوئی بیوپاری نئے چمکیلے پلاسٹک کے فریموں میں جڑے ہوئے آئینوں کے بدلے میں لے گیا..

پلنگ کے دائیں جانب جہاں داخلے کا دروازہ تھا اُس کے برابر میں ایک قدیم وضع کا سندھی جھولا پڑا تھا.. اور اس پر بھی لاکھ کے کام کی نہایت پُر آرائش اور رنگین نقاشی تھی..

پلنگ کی پائنتی کے سامنے کی پوری دیوار شیشے کی تھی..

پردے سمیٹ دیئے گئے تھے..

سورج بند شیشوں کی بڑی کھڑکی کی سطح سے ابھی اوپر تھا پھر بھی اُس کی تیز روشنی ایک خاص زاویے سے مور کے پَروں پر آویزاں اُن سات آئینوں پر پڑتی تھی تو دھندلاہٹ کے باوجود وہ چمک سے دمکنے لگتے تھے.

کھڑکی کے نیچے قطار اندر قطار پستہ قد عمارتیں تھیں جو صرف جھانکنے سے نظر آتی تھیں ورنہ اُن کے پار جو سمندر وسیع ہوتا تھا وہ پلنگ پر بیٹھنے سے کھڑکی میں سے اُمڈتا اندر آتا محسوس ہوتا تھا..

پاگل خانے کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ اُسے ایک کوٹھڑی میں بند کر لے اور جب جی چاہے اُس کا قفل کھول کر اُسے دیکھ لے..

یہ دبلی پتلی ویتنامی بچی بھی کسی ایسی ہی خواہش کی اسیر تھی.. وہ بھی اُسے اس فلیٹ میں بند کر کے جا چکی تھی..

نسان پٹرول جب اس رہائشی کامپلیکس کی ایک عمارت کے قریب آکر رُک گئی تھی تو عابدہ نے یکدم اپنے آپ کو اور اپنی مسکراہٹ اور لبادے کو سمیٹ کر نہایت نپے تلے انداز میں کہا تھا... تم قادر کے ہمراہ اوپر چلو... میں بعد میں آؤں گی.. ہمیں اکٹھے نہیں دیکھا جانا چاہئے..

گیارہویں منزل پر لفٹ سے باہر آکر.. ایک طویل اور بے آباد سی راہداری کے

آخر میں قادر نے اپنے اجرک کے نیچے کرتے کی گہری جیب میں سے ایک چابی نکال کر ایک فلیٹ کے دروازے کو کھولا تھا اور ایک گونگے خواجہ سرا کی طرح جھک کر ایک اشارے سے اُسے اندر جانے کو کہا تھا.. اُس نے اُس کا بیگ اندر رکھا اور جب وہ پلنگ کے سرہانے میں سے اُبھرے مور کے پروں پر آویزاں پرانے آئینوں کو دیکھ رہا تھا اُس کے کانوں میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی..

وہ اپنے ذہن میں حساب لگاتا رہا کہ قادر اتنی دیر میں نیچے پہنچے گا.. پھر عابدہ کو اوپر آتے ہوئے اتنا وقت لگے گا.. اور وہ اس دوران فلیٹ کا جائزہ لیتا رہا.. لیکن جب اتنی دیر سے کہیں زیادہ دیر ہو گئی.. پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو اُس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا.. اُسے دھکیلا.. بار بار ہینڈل گھمایا.. قادر اُسے مقفل کر کے جا چکا تھا... پہلے تو شدید جھنجھلاہٹ اور کسی حد تک طیش میں آکر اُس نے دوازے پر زور زور سے دستک دی... باہر نکلنے کے لئے کسی اور دروازے کی بے سود کوشش کی اور پھر تھک ہار کر پلنگ پر بیٹھ گیا.. وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے جان بوجھ کر مقفل کر دیا گیا ہے.. کوئی نہ کوئی وجہ ہو گی... کوئی مسئلہ ہو گا... اور بالآخر اس کی کوئی سادہ اور قابل فہم توجیہہ ہو گی... یہ کیسے ممکن تھا کہ... تقریباً دو گھنٹے گزر گئے.. اُس کا غصہ اور طیش بے بسی اور جھلاہٹ میں بدلنے لگے... یہ اُس کا اپنا کیا دھرا تھا.. کیا ضرورت تھی اس قسم کی مخدوش خواتین سے راہ و رسم بڑھانے کی... اپنی مردانہ انا کی تشفی کے لئے صرف ایک ٹیلی فون کال پر ملاقات کے لئے مان جانے کی... زوال کے ان برسوں میں اس قسم کے تجربے کرنے کی کیا ضرورت تھی.. پلنگ کے سرہانے پر آویزاں سات آئینوں میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا تو اُس کا چہرہ مزید دھندلا جاتا... بہت ہی مضحکہ خیز دکھائی دیتا اور عجیب سے ڈر اُس مقفل بے چارگی میں اُس کے ذہن میں اُبھرتے... ہو سکتا ہے وہ اپنی متوقع موت کی دہشت میں آکر ایک سیریل کلر میں بدل گئی ہو... دوسروں کو بھی زندہ نہ دیکھنا چاہتی ہو... یہ اُس کا طریقہ واردات ہو... اپنی گہری جنسی آواز کے گرداب میں گھیر کر اُنہیں اس فلیٹ میں لے آتی ہو... خاور کو یہ سب کچھ ممکن لگ رہا تھا اور اُس نے پلنگ سے اُٹھ کر باتھ روم کا دروازہ کھول کر یہ تسلی کی کہ کہیں اُس میں تیزاب کا کوئی ڈرم تو نہیں جس میں وہ لاشوں کو گھلاتی ہے... وارڈروب کے اندر بھی جھانکا.. وہاں نسوانی لباس اور زیر جامہ ملبوسات کے ڈھیر تھے.. اُن کے عقب میں کوئی بے جان بدن نہ تھا..

جھلاہٹ اور بے بسی نے اُسے ناتواں کر دیا اور وہ ایک غصیلے بلکہ مقدس صبر کے ساتھ قناعت کر کے جھولے پر بیٹھ گیا.. جھولنا دھیرے دھیرے جھولنے لگا..

چار بجنے کو تھے.. فرم کا جو بھی ڈرائیور اُسے ایئرپورٹ پر لینے آیا ہوگا اُس نے واپس جا کر رپورٹ کی ہوگی کہ وہ اُس فلائٹ پر نہیں آیا تھا.. اور میٹنگ اُس کے بغیر شروع ہو گئی ہوگی.. سورج ذرا نیچے آیا اور کھڑکی کے کنارے پر اٹک کر پورے فلیٹ میں جھانکتا ہوا اُسے چکا چوند کرنے لگا..

انڈس کوئین کے عرشے پر کوئی گہما گہمی نہ تھی..

رونق نہ تھی..

وہ سندھ کے پانیوں پر رات کی اتھاہ تاریکی میں ایسے سوگواری سے تیرتی تھی جیسے وینس کے کسی خصوصی گنڈولے میں کوئی تابوت سیاہ ساٹن میں لپٹا ہو اور وہ بے رونق ماتمی آہستگی سے پانیوں پر سرکتا قبرستان کو جاتا ہو..

عرشے کے درمیان میں ایک مردہ بدن پڑا تھا جس پر دھبے تھے کھرینڈ تھے..

سورج کھڑکی کے بالائی فریم سے اُترتا فلیٹ میں چند ھیا دینے والی روشنی بھرتا.. ایک طویل مدت تک اُس کا یہ نامعلوم آہستگی کا اُترنا جاری رہا اور بالآخر وہ نیچے ہو کر نچلے فریم کھڑکی کی چوکھٹ تک آگیا... اور جب اُس کی گولائی کا کچھ حصہ اوجھل ہوا اور اُس کی لشک قدرے مدھم ہونے لگی اور ساتوں آئینوں میں بھی مختلف زاویوں سے مدھم ہونے لگی تو فلیٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اندر آگئی..

ایک زرد بجھتے ہوئے زرد رنگ کی ساڑھی میں لپٹی جو اُس کے چہرے پر کھنڈتی پیلاہٹ سے میچ کرتی تھی وہ اندر آگئی.. اپنی بیماری اور زردی میں شاندار لگتی ہوئی... نہ وہ ہنسی نہ اُسے دیکھ کر ایئرپورٹ کی طرح روشن ہوئی اور نہ ہی اُس نے کوئی دلیل پیش کی اُسے یوں قید کر کے چلے جانے کی.. اور نہ کوئی معذرت کی.. اُس کا چہرہ کورا اور بے جان سا تھا..

وہ روایتی ترکیب کے مطابق خوش شکل نہ تھی.. لیکن اب نفاست سے بندھی ہوئی زرد رنگت کی ساڑھی میں اُس کا بدن ایک ناتواں مگر نوخیز بوٹے کی طرح نکلتا تھا... اور

یہ بُوٹا کھڑکی کی چوکھٹ پر اُترے ہوئے سورج کی ڈھلتی کرنوں میں سرسوں کے ایک کھیت کی زردی میں ڈھلتا تھا... وہ اس پیراہن میں بے حد رائل لگ رہی تھی جیسے جلتے ہوئے ٹرائے کے ماتم میں کھڑی ایک شہزادی ہو..

وہ کچھ دیر بنا کچھ کہے کوری اور بے تاثر اُس کے سامنے کھڑی رہی اور پھر اپنا لامبا بازو اُٹھا کر ساڑھی کے پلو کو کاندھے سے گرایا اور اُس کی گرہیں کھولنے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں.. آرام کرنا چاہتی ہوں"

زرد ساڑھی کو بڑے اہتمام سے لپیٹ کر جیسے اُس کے پاس صرف یہی لباس ہو اُس نے جھولے کی نشست پر رکھ دیا اور پلنگ پر بچھی زلی کی چادر کا ایک کونہ اُٹھا کر اُس کے اندر سرک گئی.. اُس کے زیر جامہ ملبوسات بھی زرد رنگ کے تھے اور جسم کی زردی سے الگ نہ ہوتے تھے.. اور جب وہ اپنے آپ کو چادر کے اندر سرکا رہی تھی تو اُس کے بدن پر جو دھبے اور کھرینڈ تھے' وہ زردی سے الگ ہو کر نمایاں ہو رہے تھے اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی..

خاور نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ آگئی تو میں کن لفظوں میں اُسے بے عزت کروں گا چیخوں گا... اور پھر اپنا بیگ اُٹھا کر اس رابطے سے اور اس فلیٹ سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤں گا لیکن وہ گُنگ ہو گیا.. خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا... اُسے ناپسند کرنے کی کوشش کرتا رہا.. اگر تو وہ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی "آئی ایم سوری" یا کوئی اور معذرت کرتی اُس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی تو وہ یقیناً اُسے پرے دھکیل کر شاید اُس پر ہاتھ اُٹھا کر پھٹ پڑتا... لیکن اُس کے چہرے کی آزردگی اور تھکن نے وہ تمام لفظ گنوا دیئے... جیسے آپ نیند میں چلنے والے ایک شخص سے ناراض نہیں ہو سکتے' اُسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے اگر ایسا کریں گے تو خود ہی مجرم محسوس کریں گے.. خاور نے صرف اُن کے درمیان آئی ہوئی خاموشی کو توڑنے کے لئے بغیر کسی شکایت یا رنجش کے کہا "تمہیں یہ تو معلوم تھا کہ مجھے آج چار بجے کسی شوق کی خاطر نہیں' اپنی روزی کے حصول کے لئے ایڈورٹائزنگ فرم کی میٹنگ میں پہنچنا تھا.. میں اُن کے خرچ پر یہاں آیا ہوں.. اُن کے لئے آیا ہوں"

"پلیز میرا ہینڈ بیگ مجھے دے دو"

مراکو لیدر کا فیشن کردہ ہینڈ بیگ جھولے کی نشست پر تہہ شدہ ساڑھی کے برابر

میں پڑا تھا..

خاور نے خاموشی سے تعمیل کر دی..

وہ کہنیوں کے بل اُٹھی.. اُس کے بازو بہت ناتواں تھے.. اُنگلیاں لامسی اور کمزور تھیں جن سے اُس نے ہینڈ بیگ کی زِپ کھولی اور اُس میں سے کرنسی نوٹس کا ایک نیا اور کورا پلندہ نکالا "تمہیں وہاں سے کتنی روزی ملے گی؟... اتنی تو اگلے پانچ برس میں بھی نہیں ملے گی... یہ تم رکھ لو... میرے لئے یہ بیکار ہیں.. لیکن پلیز میرے پاس رہ جاؤ.. آئی بیگ یُو.." کچھ دیر لرزتی اُنگلیوں سے اُس نے نوٹوں کے پلندے کو تھامے رکھا.. اور پھر اُسے بے دلی سے ایک جانب پھینک کر رَلی کی چادر کے اندر ہو گئی اور اُس میں منہ چھپا کر رونے لگی..

وہ کھڑکی کی جانب پشت کئے کھڑا تھا اور اُس کے سامنے پستہ قد پلنگ پر بچھی رَلی کے اندر اُس کا بدن سسکیوں سے لرزتا تھا.. کبھی بالکل ساکت ہو جاتا تھا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کپکپانے لگتا تھا.. رونے کی آواز نہیں آتی تھی..

سورج کھڑکی کی چوکھٹ پر ابھی تک اٹکا ہوا تھا اور اُس کی چمک پہلے سے ماند ہوتے ساتوں آئینوں میں مزید بجھتی تھی.. خاور اُس کے سرہانے بیٹھ گیا اور رَلی کی چادر کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگا.. "پلیز تم روؤ نہیں.."

بہت دیر تک اُسے ایک بچے کی طرح... جیسے اُسے سلانے کی کوشش میں ہو تھپکتا رہا.. اُس کی ہر سسکی رَلی کی چادر میں سے سرائیت کرتی اُس کی اُنگلیوں میں اُترتی اور پھر اُس کے پورے بدن میں پھیل جاتی..

اُس کی سسکیاں کم ہونے لگیں.. اور پھر رَلی کے اندر سے اُس کی ایک عجیب مٹتی ہوئی لاچار آواز آئی "میرے بیگ کو کھول کر دیکھو کہ اُس کے اندر کیا ہے.."

"تم خود کیوں نہیں اُٹھتیں.. میں کہیں نہیں جا رہا.."

"نہیں.. میں تمہارا سامنا نہیں کر سکتی.." چادر میں سے اُس کی بے چارگی میں ڈوبتی آواز آئی "تم میرے بیگ کو کھول کر دیکھو"

خاور نے سائڈ ٹیبل پر دھرے بیگ کو اُٹھا کر اُس کی زِپ کھولی... کچھ رقم تھی.. کریڈٹ کارڈز... سٹورز کے بل.. میک اپ کا کچھ سامان.. کچھ سادہ کاغذ اور ایک بال پوائنٹ.. اور کچھ رپورٹیں تھیں نسخے تھے... پاگل خانے کے بیگ کی تلاشی لینے کے دوران

جس قسم کے کاغذات برآمد ہوئے تھے ان کی نوعیت بھی اُن سے ملتی جلتی تھی.. ان پر لنڈن اور کراچی کے معروف ہسپتالوں کے نام تھے..

"کیا تم دیکھ رہے ہو؟" اُس نے چادر کے اندر سے پوچھا..

"ہاں..."

"یہ میری فائنل رپورٹس ہیں خاور... پچھلے ہفتے ایک مرتبہ پھر.. شاید ہزارویں مرتبہ پھر میرے تفصیلی ٹیسٹ ہوئے.. میں تین روز کے لئے انگلینڈ گئی تھی ڈاکٹر اینڈریو کے بلانے پر... اُنہوں نے میرے بدن کے ہر حصے سے کچھ نہ کچھ کاٹا.. میرا آدھا خون نکال لیا.. اور پھر یہ رپورٹس دیں.. کیا تم انہیں دیکھ رہے ہو؟"

رپورٹس بہت طویل اور تفصیلی تھیں اور جو کچھ اُن پر درج تھا وہ زبان اُس کی فہم سے بالاتر تھی.. طبی محاورے' نامانوس لفظ اور ہندسے تھے..

"میں انہیں نہیں سمجھ سکتا.."

عابدہ سومرو نے رَلی کو نیچے کیا اور اُس کا آنسوؤں سے تر زرد چہرہ خاور کے سامنے آگیا جس کے عقب میں پلنگ کے سرہانے پر تراشیدہ مور کے پروں میں آویزاں ساتوں آئینوں میں ڈھلتے سورج کی کرنیں بجھ رہی تھیں "مجھے صرف دس دن دیئے گئے ہیں.. صرف دس دن.. زیادہ سے زیادہ"

وہ سکتے میں آگیا.. سمجھ تو گیا لیکن اس کے باوجود اُس نے کہا "میں سمجھ نہیں سکا"

"میں مر جاؤں گی دس دن کے اندر اندر... ایز سمپل ایز دیٹ... اور تم اپنی چار بجے کی میٹنگ کے بارے میں فکر مند ہو.."

"نہیں.. یہ.. یہ کیسے ہو سکتا ہے.."

"اگر کوئی شخص دس دن کے اندر اندر نہ مر رہا ہو تو وہ کہے گا کہ میں مر رہا ہوں.. موت میں مزاح کی گنجائش تو نہیں ہوتی خاور ڈارلنگ..." اُس نے آنسو پونچھے اور بے اختیار ہنسنے لگی... ہنستی گئی.. اور وہ اُسے دیکھتا رہا.. اُس کی ہنسی میں ہسٹریائی عنصر قطعی شامل نہ تھا' وہ بے بسی اور اختتام کے آگے ہتھیار ڈال دینے والے ایک لاچار شخص کی ہنسی تھی..

"میں تمہارے پاس ٹھہروں گا عابدہ.. جب تک کہ تم کہو.. لیکن مجھے یقین ہے کہ

ایسا نہیں ہوگا.. کیونکہ دنیا میں کوئی شے بھی حتمی اور یقینی نہیں ہوتی.."

"میرے پاس آجاؤ.." اُس نے رَلی کا کونہ اُٹھایا اور سمٹ کر پرے ہو گئی "آئی ایم سوری کہ میں تمہیں لاک کر کے چلی گئی تھی.. میں تم سے ٹھہرنے کو نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم نہیں ٹھہرتے اور اپنی میٹنگ اٹینڈ کرنے کے لئے چلے جاتے.. لیکن میں نے گھر واپس جا کر پھر سے باہر نکلنے کا کوئی بہانہ بنانا تھا.. یہ نہیں کہ کوئی بھی پرواہ کرتا ہے کہ میں کہاں جاتی ہوں اور کیوں جاتی ہوں لیکن محض ریکارڈ کی خاطر مجھے گھر واپس جانا تھا.. خدا بخش اگلے الیکشن کے لئے جوڑ توڑ کر رہا ہے... بابا سائیں اپنی پارٹی بدلنے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں اور وہ میرے ہونے یا نہ ہونے سے آگاہ نہیں ہوتے.. صرف میری بیٹی ہے.. اور وہ بھی کیوٹ تھنگ یہ نہیں جانتی کہ اُس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے... وہ اپنے کارٹون دیکھتی ہے اپنی گیمز کھیلتی ہے... صرف تم ہو خاور جس سے میں بات کر سکتی ہوں اور کوئی نہیں.."

"تم نے خدا بخش کو بتایا ہے.. ان فائنل رپورٹس کے بارے میں.."

"ہاں بتایا ہے.. لیکن وہ ایک پیدائشی سیاستدان کی مانند بہت میٹھا اور بہت تسلی دینے والا شخص ہے.. میری ڈھارس بندھاتا ہے کہ نہیں عابدہ یہ رپورٹس غلط ہیں.. ان ڈاکٹروں کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ تو اپنی فیسوں کے لالچ میں مریضوں کو خوفزدہ کرتے ہیں.. ڈاکٹر اینڈریو چونکہ تم پر مرمٹا ہے اس لئے وہ تمہیں اپنے قریب رکھنا چاہتا ہے.. تم بالکل فکر نہ کرو تمہیں کچھ نہیں ہوگا.. اور خاور.. اُس لمحے میں اُس کی آنکھوں میں دیکھ سکتی ہوں کہ اگر اُس کے کسی پسندیدہ اور لاڈلے کتے کے بارے میں ویٹنری ڈاکٹر یہ رپورٹ دے کہ وہ اگلے دس دن میں مر جائے گا تو وہ... اتنا رنجیدہ بھی نہیں ہوتا.. یہ میں دیکھ سکتی ہوں... اور اُنہی آنکھوں میں میں اُس لڑکی کو بھی دیکھتی ہوں جو میرے بعد فوراً میری جگہ کو پُر کر دے گی..." عابدہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپتی رَلی کی چادر سے الگ کر دیا اور وہ انڈس کوئین کے ویران عرشے پر پڑی برہنہ دیت نامی بچی تھی "میری تمنا تھی کہ میری سویٹی بیٹی کے بعد تم سے مجھے ایک بیٹا ملے اور میں اُس کا نام یاور رکھوں.. لیکن دس روز کے اندر اندر تو یہ ممکن نہیں ہوگا.." وہ پھر سے ہنسنے لگی.. اور اس ہنسی میں کوئی بے چارگی یا مرگ کا خوف نہ تھا بلکہ ایک بیباک اور آزاد اظہار کی ہنسی تھی... "میں تمہیں ایک نظم سناؤں.." وہ ہنستے ہنستے تھم گئی..

"نظم...؟"

"ہاں... یا جو کچھ بھی میں کہنا چاہتی ہوں.. تم سے.. اپنے آپ سے.. سناؤں؟"

"ہاں..."

اُس نے ہینڈ بیگ کو پلنگ پر اُلٹ کر.. میک اپ کے سامان.. کریڈٹ کارڈز اور رپورٹس میں سے ایک کاغذ تلاش کیا اور آنکھیں پونچھ کر اُسے پڑھنے لگی... جیسے درخواست پیش کر رہی ہو.. ایک رپورٹ دے رہی ہو..

میں نے سنا ہے..
برگزیدہ ہستیوں سے میں نے سنا ہے کہ..
خدا کے نیک بندوں کے بدن کو مٹی نہیں کھاتی..
مٹی کو منا ہی ہے کہ وہ اُن کو مٹی کر دے..
پر میں تو نیک بندوں میں شامل نہیں ہوں..
میں تو گناہوں اور خواہشوں کے گرداب میں گھومتی ہوں..
تو مٹی میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی..
مجھے کھا جائے گی..
ملیامیٹ کر دے گی..
اپنے ساتھ مٹی کر لے گی..
تو اُسے کیا ملے گا؟.. کچھ بھی نہیں.. نا آسودگی اور پیاس کے سوا کچھ بھی نہیں!
مٹی کے بوجھ تلے..
کیڑوں کو اپنے مردہ بدن پر رینگتے ہوئے..
میں صرف یہ کہوں گی.. ٹھہرو...
قربت مرگ میں مجھے محبت ملی تھی..
میری تمامتر آلائشوں اور ناپاکیوں کے باوجود، مجھے ملی تھی..
اور اُس نے مجھے پُوتر کر دیا ہے..
تم.. اے مٹی.. مجھے ریزہ ریزہ کر کے اپنے آپ میں شامل کر لو تو بھی..
میں فنا نہیں ہو سکتی..

کیونکہ اس محبت نے مجھے برگزیدہ کر دیا ہے..
میں ڈوبتے سورج کے زرد تھال کو دیکھتی اور اُسے بیان کرتی تھی..
اور وہ میرے چہرے پر جھکا تھا مجھے سنتا تھا..
اور میں کھلی آنکھوں سے اُس کے بدن کے پار.. پرے..
کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکے سورج کو بیان کرتی تھی..
یہ میرے آخری لمحے تھے..
آخری سانس تھے..
تو اے مٹی... تو مجھے ملیامیٹ نہیں کر سکتی..
مجھے اپنے آپ میں مٹی نہیں کر سکتی..
تو مجھے کھا نہیں سکتی.. فنا نہیں کر سکتی..
اس لئے کہ..
میں بھی نیک بندوں میں سے ہوں..
برگزیدہ ہوں..
پلنگ کے ساتوں دھندلاتے ہوئے آئینوں میں کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکے سورج کی ٹھنڈی ہوتی گول پرات تھی..

وہ اُس کے چہرے پر جھکا تھا اور اُس کی مرگ پیلاہٹ میں پیلا ہوتا تھا اور اپنی پشت پر پلنگ کی پائینتی کے پیچھے کھڑکی کی چوکھٹ پر اٹکا جو زرد غروب کا سورج تھا اُسے نہ دیکھ سکتا تھا لیکن وہ اُسے بیان کر رہی تھی.. "دیکھو خاور.. میں تمہیں دکھاتی ہوں اور تم مجھ پر جھکے مجھے دیکھتے رہو اور میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ اس لمحے زرد تھال کے سامنے سے سمندری بگلوں کی ایک ڈار گزر رہی ہے.. اور ہر بگلے کا ایک ایک پَر جو اُڑان میں ہے الگ الگ دکھائی دے رہا ہے.. وہ اگرچہ سفید ہیں لیکن اس لمحے زرد ہیں جیسے سرسوں کے کھیت میں سے نہا کر نکلے ہوں... سورج اب ایک ٹھنڈے ہوتے پگھلاؤ میں نیچے ہو رہا ہے.. میری آنکھوں میں وہ سورج ہے.. زرد سمندری پرندوں کی ڈاریں ہیں.. اور دیکھو وہ ڈاریں گزر گئی ہیں اور سنہری تھال پھر سے ویران ہو گیا ہے... لیکن ابھی ابھی ایک اور پیچھے رہ جانے والا پرندہ اُس کی زردی میں داخل ہوا ہے اور نکل گیا ہے.. تھال پھر سے ویران ہو گیا ہے لیکن میں ویران نہیں ہوئی بھری ہوئی ہوں.."

چوبی مور کے پروں میں آویزاں ساتوں آئینوں میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا..
اُس کے کھلے منہ کے اوپر جو کھلی آنکھیں تھیں اُن میں اُس زرد تھال کو دیکھتا تھا جس کے اندر ابھی ابھی ایک پرندہ اپنی سفیدی کھو کر زرد ہوا تھا اور پھر نکل گیا تھا..
سات آئینے تھے جن میں اُس کا زوال پذیر بدن دکھائی دیتا تھا..
اُن سب میں سے ابھی ابھی ایک پرندہ اپنی سفیدی کھو کر زرد ہوا تھا اور پھر نکل گیا تھا..

قربت مرگ میں محبت گہرے بوجھل سانس لیتی تھی..
ان سانسوں سے سائیڈ ٹیبل پر بکھری فائنل رپورٹس نم ہوتی تھیں..
پلنگ کے سرہانے چوبی مور کی چونچ کھل گئی.. می آؤں.. می آؤں..

ے وصل ہوئیاں میں نال سجن' شرم حیا نوں گوا کے
وچ چمن میں پلنگ وچھایا یار سُتی گل لا کے

ایس عشقے دی جھنگی وچ مور بولیندا...
اُس پلنگ کے سرہانے بھی ایک مور بولا تھا..
ساتوں آئینوں نے الگ الگ کلام کیا تھا..
ہر آئینے میں جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی.. اور ہر تصویر جدا تھی اور اُس میں ہولے ہولے جان پڑتی تھی.. غروب کا سورج بدنی زاویوں سے کچھ زاویے نمایاں کرتا تھا..
سات آئینوں میں سات متحرک سچ تھے..

کشتی ہولے ہولے ڈولتی ڈھلتی دوپہر کے سورج کی آخری تمازت میں کنارے کی گیلی ریت کو کندھے مارتی تھی.. اگر یہاں بھی ایک کھڑکی ہوتی تو وہ اس سے اس کی چوکھٹ پر ٹکا ہوتا... وہ رکے ہوئے تھے..
جہاں کشتی اپنے کھونٹے سے بندھی پانی میں بے چین ہوتی کناروں سے سر ٹکراتی تھی وہاں سے کچھ دوری پر سرور گھٹنوں تک آئے پانیوں میں لنگوٹ باندھے جھکا... جھکا پانی کے اندر بہت دھیرے دھیرے دونوں ہاتھ حرکت میں لاتا تھا.. جیسے نابینا جانتا ہو کہ راستے میں ٹھوکر کھانے کے بہت سے اسباب بکھرے ہوئے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلائے ان میں.. اپنی انگلیوں میں پوری توجہ بھر کر آہستہ آہستہ ہوا کو ٹٹولتا ہوا چلتا ہے... یکدم سرور نے دونوں ہاتھ پانی میں سے یوں اچھال باہر کئے جیسے کسی شے نے اسے ڈس لیا ہو.. سندھ کے گدلے چھینٹے اس کے بدن پر آگرے اور اس کے سیاہی کو مزید گہرا کرتے ٹانگوں پر لکیریں بناتے پھر سے دریا میں جذب ہو گئے "ادھر سے دھی یا کھگا غیب ہے ماماں..." اس نے اپنا آپ پانی میں

سے کھینچ کر باہر کیا اور جعفر کے پاس آگیا جو اپنے تکونے جال کو ریت پر ٹکائے اس کی ڈوریوں میں گانٹھیں دے رہا تھا" پچھلے ایک پہر سے تو ٹھنڈ کے مارے پانی میں کھڑا ٹھٹھرتا ہوں کہ کوئی کھگا ہاتھ سے لگ کر گذرے تو سہی تو میں اسے صاحب کے لئے باہر اچھال دوں پر ادھر تو قحط پڑ گیا ہے ماماں.. رب کا نام لے کر پانی میں اترا تھا کہ مالکا کوئی دو چار دانے کھگوں کے رات کی ہانڈی کے لئے ہاتھ لگا دے.. تو بھی کچھ ہاتھ میں نہیں آیا۔"

ایک اور گرہ لگا کر ماماں جعفر نے اسے تھوک لگا کر پکا اور پیڈا کیا اور بولا "سرور.. پچھلے کتنے روز سے رب کا نام لے کر پانی میں اتر تا رہا ہے ناں تو کچھ ملا؟... وہ سن نہیں رہا.. تو آج اس کا نام نہ لیتا تو شائد کچھ مل جاتا.."

مونا شکاری عطاء اللہ کسی خاص منصوبے کے تحت ان کے برابر چلتا آرہا تھا.. وہ کشتی میں چلتے تھے اور وہ کناروں پر جو دیہات 'کھیت 'ٹیلے اور جنگل ذخیرے سروٹوں اور کاہی کے تھے وہ ان میں سفر کرتا تھا.. وہ کشتی میں کم ہی سوار ہوتا.. پر انہیں نظر میں رکھتے ہوئے کناروں پر چلتا جاتا.. ایک رات ان کے ہمراہ بسر کرنے کے بعد وہ پھر ان کے کیمپ میں سونے کے لئے نہیں آیا تھا.. ہر دوسرے تیسرے روز کہیں نہ کہیں اپنی توند پر کھسکتا تہبند ایک ہاتھ سے سنبھالتا اور دوسرے میں بندوق تھامے وہ نظر آجاتا.. اس ڈھلتی دوپہر میں جب وہ ستانے کے لئے رکے تھے اور سرور کھگے پکڑنے کے لئے پانی میں اترا تھا اور ماماں اپنا تکونا جال مرمت کرتا تھا عطاء اللہ پھر نمودار ہو گیا تھا۔

"سائیں سرخابوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہوں.. ان ٹیلوں کی اوٹ میں اترے ہیں.. سائیں شغل کرنا ہے تو میرے ساتھ آؤ.. ہاں سائیں آجاؤ ادھر بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو.. پر ساتھ آنا ہے تو صبر کے ساتھ ایسے آؤ کہ پاؤں کے نیچے کی ریت بھی نہ کھسکے.. سرخاب ذرا سی آہٹ پر... ریت کے ایک ذرّے کے کھسکنے سے پَر کھول دیتا ہے اور اڑ جاتا ہے.. شغل کرو سائیں.."

"تمہاری مہربانی..." ڈوری سے بندھی جل مرغی ابھی تک اس کے سامنے پھڑ پھڑاتی پانی پر تیرتی اپنے تئیں غائب ہونے کے لئے ڈبکیاں لگاتی... آپو آپ کنارے کی جانب کھنچتی چلی جاتی اور عطاء اللہ شغل کرتا... خاور کو اب بھی اس کے ہاتھوں میں وہی ڈوری دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا.. لیکن اپنی ناپسندیدگی کو نفرت سے عیاں بھی

نہیں کرتا تھا.. "نہیں عطاءاللہ آپ شغل کرو۔"

وُہ اپنا تہبند سنبھالتا.. جھکا جھکا ریت کے ان ابھاروں کی جانب بڑھنے لگا جن کے عقب میں بقول اس کے سُرخابوں کا ایک جُھنڈ اترا تھا..

پہاڑوں اور پانیوں کا سفر دنوں کا حساب کتاب بھلا دیتا ہے.. راتیں کتنی گذر چکی تھیں یہ بھی کچھ یاد نہ تھا.. شائد تین یا تیں کچھ واضح نہ تھا.. سوائے اس کے کہ... کشتی چلتی جاتی تھی کنارے پیچھے رہتے جاتے تھے.. بہاؤ بہتے ہوئے مسلسل سنائی دیتے تھے.. کبھی دھوپ ہوتی تھی اور کبھی چھاؤں اور رات ہوتی تو الاؤ جلتا تھا اس کے سوا کچھ اور واضح نہ تھا..

ریت پر بیٹھا.. اس کی تپش کو اپنے بدن کے اندر سرائت کرتے محسوس کرتا.. خاور.. فہیم کی تیار کردہ دھواں لگی چائے کے گھونٹ بھرتا تھا.. اس کے سامنے ریت کنواری اور سپاٹ تھی تھوڑی دیر پہلے تک.. اور اب اس پر عطاءاللہ کے بھاری قدموں کے نشان تھے جو ٹیلوں پر بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے..

کشتی کے اندر اس کے سلیپنگ بیگ پر بے پروائی سے لیٹی ٹانگیں پھیلائے پکھی اپنا جھگا اٹھائے بچے کے منہ کے قریب اپنی چھاتی کرتی تھی اور بظاہر لاپروا تھی لیکن اس کی سیاہ آنکھوں میں ناآسودگی کی جو شکایت تھی وہ خاور تک.. اس کی چائے کی پیالی تک پہنچ کر اس کے لب جلاتی تھی..

"کھگا ملے گا سرور..." ماماں جعفر جال کی مرمت سے فارغ ہو کر اٹھا اور اپنے کولہوں سے ریت جھاڑتے ہوئے کہنے لگا "بس رَب کا نام نہ لینا... وہ آج نہیں سن رہا۔"

جعفر اپنی دھوتی ٹانگوں کے درمیان اڑس کر پانی میں اتر گیا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے سرور کی مانند پانی کو ٹٹولنے لگا۔ وہ نیچے نہیں دیکھتا تھا بلکہ نظر سامنے رکھتا تھا اور ہاتھ چلائے جاتا تھا۔ وہ دیکھتا دریا پار کے سرکنڈوں کو تھا مگر اس کے ہاتھ پانی کے اندر ہی اندر چلتے جاتے تھے.. کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر مچھلی کے شوق کی بجائے فکر مندی کی سیاہی پھیلنے لگی.. وہ جھکا ہوا تھا تو سیدھا ہو گیا اور پھر اپنی ٹانگوں کو غور سے دیکھا.. ان تک آئے پانی کی سطح کو دیکھتا رہا جو گھٹنوں سے ذرا نیچے تھے اور صرف سرور کو مخاطب کیا۔ "نہ ہونے والی بات لگتی ہے پر ہے۔"

"کیا ماماں..." سرور خوش تھا کہ ماماں کے ہاتھ بھی کچھ نہیں لگ رہا۔

"سندھ کے پانی کم ہو رہے ہیں سرور..."

"اس رُت میں تو پانی کم ہوتا ہے ناں ماماں... ساون تھوڑا ہے کہ شوکتا ہے اور اونچا ہوتا ہے۔"

"تم مجھے سبق پڑھاتے ہو پانیوں کا..." ماماں جیسے طیش میں آگیا ہو۔ "میں نہیں جانتا کہ اس رُت میں پانی تھوڑا ہو جاتا ہے اور کتنا تھوڑا ہوتا ہے اور کس کس جنگل بیلے میں کتنا کم ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا..."

"معاف کردو ماماں... میں نے تو یونہی بات کردی تھی..." سرور نے ہاتھ جوڑ کر شرمندگی سے کہا۔

"اِدھر جہاں میں کھڑا ہوں اس رُت میں... اِس جگہ پر میں ہمیشہ کھڑا ہوتا ہوں مچھلی کے شوق میں... جب میں نیانا تھا تو اپنے بڑے کے ساتھ ادھر آتا تھا تو ادھر پانی اتنا اونچا رہتا تھا کہ میرے بڑے کے گھٹنوں تک آتا تھا... پھر میں بڑا ہوا تو میرے گھٹنوں تک آتا تھا ہمیشہ... پچھلے برس اس رُت میں انہی دنوں میں... یہ میرے گھٹنوں کو چھوتا تھا پر اب کی بار عجیب بات ہے کہ بہت نیچے ہے..."

"ادھر پہاڑوں میں کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو گی... مینہ پانی کم برسا ہو گا۔"

"نہیں سرور... مجھے لگتا ہے کہ سندھ سوکھ رہا ہے..."

"ماماں بوٹی نے کام دکھایا ہے۔" سرور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا "سندھ سائیں کیسے سُوکھ سکتا ہے"

"تم مجھ سے دین ایمان کی سونہہ لے لے.. بناشک بُوٹی کا کجاد یکھ لے.. جو میں نے سویرے ایک گھونٹ بھی ساوی کا پیا ہو۔"

"نہیں پیا تو اب ڈیک لگا لے... سندھ میں پانیوں کی لہر بہر ہو جائے گی.." سرور دانت نکالنے لگا.. ہنسنے لگا.. پر جعفر کے سیاہ چہرے پر تشویش کی دھاریں کم نہ ہوتی تھیں.. دھوپ میں بہت حدت تھی اور وہ ریت کو ایسے جھلساتی تھی جیسے یہ چیتر کا مہینہ نہ ہو۔

ایک ٹیلے کے عقب میں سے موٹا عطاء اللہ ابھرتا گیا.. اس کا تہبند اس حد تک اس کی توند سے ڈھلکا ہوا تھا کہ اس کے کچھ بال جو دکھائی نہیں دینے چاہیے تھے وہ بھی دکھائی دے رہے تھے اور وہ ایک مست چال سے ریت میں سے پاؤں نکالتا ایک ہاتھ سے بندوق